پرولتاری آمریت اور لینن

جناب عثمان غنی صاحب ایم - اے

(۱)

مغربی فلسفہ و فکر کی یہ خصوصیت نہایت نمایاں ہے کہ اس کی ساری اٹھان منفی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ وہاں ہوتا یوں ہے کہ کسی خاص پریشان کن اور ہولناک صورتِ حال سے جب لوگ تنگ آجاتے ہیں تو اس کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس ردِ عمل سے جذبات بُری طرح مغلوب ہو جاتے ہیں اور ان کی شدت اس قدر بڑھتی ہے کہ عقل ان سے دب کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سوچ میں توازن نہیں رہتا بلکہ انتہا پسندی آجاتی ہے۔ اس وقت یہ احساس غالب ہوتا ہے کہ کسی طرح اس موجودہ مصیبت سے جان چھوٹے باقی رہی یہ بات کہ اس سے بھاگ کر جس طرف رُخ کیا ہے اس کی انتہا کیا ہو گی تو منفی جذبات سے مغلوب عقل اس کی تفصیلات پر غور کی صلاحیت سے بڑی حد تک عاری ہو چکی ہوتی ہے۔

مذہب کے خلاف منفی ردِ عمل یورپ میں عیسائی پادریوں کی تنگ نظری، تعصب، فلسفہ رہبانیت، فکری و عملی جمود، روایت پرستی، علم دشمنی، علم و تحقیق کے شیدائیوں پر سفاکانہ مظالم اور احمقانہ حد تک اقتدار کی حمایت کے خلاف اہلِ فکر و دانش میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا تو انہوں نے صرف عیسائیت کے نفلذ نمائندوں کی ان قابلِ مذمت حرکات ہی کے خلاف آواز نہ اٹھائی بلکہ منفی طرزِ فکر کے تحت وہ دوسری انتہا تک پہنچ گئے اور انہوں نے غالباً نیک نیتی سے عیسائیت دشمنی ہی نہیں بلکہ مذہب دشمنی اور وحی والہام کی مخالفت کی صدا پوری قوت سے بلند کی۔ اس وقت انہوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اصل قصور کس کا ہے؟ پادریوں کا، عیسائیت کا، مذاہب کا یا وحی والہام کا؟ انہوں نے مذہب دشمنی کی مہم چلائی اور اسے عقلیت پسندی (ریشنلزم) اور آزاد خیالی (لبرل ازم) کے خوبصورت لبادے اُڑھائے۔

عقلیت پرستی کا ظاہری طور پر جو بھی مفہوم ہو، عمل کی دنیا میں اس کا مطلب وحی، تنزیل، الہام و نبوّت اور کتبِ سماوی کی مخالفت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی طرح آزاد خیالی اور آزاد روی کی تشریح جو کچھ بھی کی جائے اُس کی حقیقت مذہبی شعائر، مذہبی روایات، دینی تصورات پر مبنی مستقل اخلاقی اقدار اور حلال و حرام میں تمیز کے خلاف بغاوت کے سوا کچھ نہیں۔

عمومی افراط و تفریط | مذہب بیزاری اور دین دشمنی کے منفی جذبہ پر مبنی عقلیت پرستی اور آزاد خیالی کی تحریکوں نے زندگی کے عملی شعبوں میں مختلف روپ دھارے۔ سیاست میں اس کے مظاہر قومیت پرستی، سرمایہ دارانہ جمہوریت، فاشزم، نازی ازم اور امپیریلزم وغیرہ بنے۔ اخلاقیات میں لذتیت، اباحیت پسندی اور افادیت پرستی کو معیار مانا گیا۔ معاشیات میں "عدم مداخلت" (LAISSEZ-FAIRE) اور "خونیں مسابقت" (CUT-THROAT COMPETITION) کی پالیسی پر عمل درآمد ہوا، معاشرت میں اخلاص، بے لوث ایثار اور حقیقی محبت و اُلفت کی جگہ منافقت، خود غرضی، نفرت، حسد اور بغض نے لے لی۔

اس طرزِ فکر و عمل کا نتیجہ حیوانیت کے غلبے اور انسانیت کی شکست کی شکل میں سامنے آیا۔ اس لیے کہ حیوانیت اپنی آزاد مرضی سے کسی اصول کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے فطری اور جبلی داعیوں اور خارجی حالات کے آگے سرنگوں ہونے کا نام ہے اور انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ آدمی اپنی آزاد مرضی سے بلند تر مقاصد، اعلیٰ اصولوں اور اجتماعی فلاح کی خاطر حدود و قیود کا پابند ہے۔

حیوانی زندگی میں جسمانی قوت فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں طاقتور کو یہ حق حاصل ہے کہ کمزور کو دبائے، چیرے پھاڑے اور کھائے۔ عقلیت پرستی اور آزاد خیالی و آزاد روی کی بدولت حیوانیت کو فتح ہوئی، تو "قوت حق ہے" کا ضابطہ انسانی زندگی میں جاری و ساری ہوا اور دولت اور مادی طاقت کے بل بوتے پر قوی افراد و اقوام نے کمزور افراد اور کمزور معاشروں کا خون چوسنا شروع کیا اس فلسفے کے موجد بڑے نیک نیت ہی سہی، لیکن اس پر عمل کرنے والوں نے نہایت بے رحمی، حد درجہ سنگ دلی اور ناقابلِ تصور حد تک سفاکی کے ساتھ طاقت سے مدمست درندوں کی طرح اپنے ہی بھائی بندوں کی عزت و آبرو، آزادی اور جان و مال پر دست درازیاں کیں۔ یہ قارون کی طرح دولت کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھے رہے جبکہ ان کی بستیوں میں بے شمار

انسان بلکہ خود ان کے اپنے خادم پیٹ بھرنے کے لیے سوکھی روٹی، تن ڈھانکنے کے لیے معمولی کپڑے، موذی امراض سے نجات پانے کے لیے سستی دوا اور سر چھپانے کے لیے معمولی جھونپڑے کی خاطر تڑپتے رہے۔

مارکس اور اس کے نظریات اس رویّے کے خلاف پھر نفرت پیدا ہوئی، لوگ سخت بے چین ہوئے اور انہوں نے اپنے اضطراب کا اظہار شروع کیا۔ اس وقت جرمنی کا مشہور یہودی النسل مفکر کارل مارکس پیدا ہوا۔ غربت کے مختلف دلفگار مظاہر اور سرمایہ کے انسانیت سوز مظالم دیکھ کر اس کے اندر بھی شدید ردِّعمل پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ساری صلاحیتیں تحقیق و تجسس پر صرف کر دیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ خرابی کی اصل جڑ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی نجی ملکیت میں ہیں، جن کو استعمال کر کے وہ کمزوروں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس کے فکر کی بنیاد بھی چونکہ منفی تھی اور اس کا فلسفہ بھی چونکہ ردِّعمل پر مبنی تھا اس لیے اس نے اس خرابی سے نجات کا راستہ یہ تجویز کیا کہ ذرائع پیداوار نجی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت میں دے دیے جائیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کو جو آزادیٔ فکر، آزادیٔ سعی و عمل اور اس سعی و جہد سے آزادانہ اور غیر محدود تمتع کا جو حق حاصل تھا، اس حکیم معاش نے اسے تمام مصیبتوں کا سرچشمہ قرار دیا اور ردِّعمل کے طور پر یہ کہا کہ فرد کی اس آزادی کو معاشرے کی اجتماعی فلاح و ترقی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جائے اور ساتھ ہی یہ مژدہ بھی سنایا کہ معاشرہ ترقی کرے گا تو اس سے فرد کو فائدہ پہنچے گا۔ ردِّعمل پر قائم ہونے والے اس فلسفے نے امیر اور غریب کے درمیان شعوری طور پر نفرت کے بیج بوئے اور ان میں نہایت وسیع خلیج حائل کر دی۔

کارل مارکس نے نفرت پر مبنی فکر پیش کر دی، انفرادی ملکیت کی بعض مذموم خرابیوں کے ردِّعمل کے طور پر اجتماعی ملکیت کا منصوبہ بھی تیار کر دیا، یہ بھی کہا کہ عبوری دور میں حکومت مزدوروں کے قبضے میں ہونی چاہیے۔ یہ پیشین گوئی بھی فرمائی کہ اجتماعی ملکیت اور مزدوروں کی حکومت کے نتیجے میں دولت کی بنیاد پر طبقات ختم ہو جائیں گے، ریاست آہستہ آہستہ خود بخود تحلیل ہو جائے گی اور ایک ایسا مثالی معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا جس میں ہر ایک اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق معاوضہ ملے گا۔ اس سوسائٹی میں کوئی ایک دوسرے کا استحصال نہیں کرے گا۔

یہ سب باتیں فلسفے کی بڑی دلربا اور مسحور کن زبان میں کی گئیں لیکن مارکس نے اپنے منصوبے کے بہت سارے عملی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے متبعین میں زبردست اختلافات فکری سطح پر بھی رونما ہوئے اور عمل کی دنیا میں بھی نوبت گالی گلوچ، دھینگا مشتی، سر پھٹول اور قتل و غارتگری تک پہنچی۔ مارکس نے مزدور کے درد سے متاثر ہو کر جو خیالات پیش کیے انہیں جب لینن نے بے شمار سوشلسٹ مفکرین، رہنماؤں اور کارکنوں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے مخصوص طریقے سے عملی جامہ پہنایا تو دوسروں کو چھوڑیے خود مزدور طبقہ کی ایسی درگت بنی کہ اگر مارکس زندہ ہوتا اور وہ اپنی آنکھوں سے مزدوروں کی حالتِ زار دیکھتا تو شاید اس صورت حال کے ردعمل میں وہ لینن کے اس انسان کش انقلاب سے اظہارِ برأت کرتا اور اس سوشلزم کے مقابلے میں کوئی نیا تصور پیش کرتا۔

لینن اور مارکس کے باہمی تضادات و ابہامات: اس بنیادی بحث کے بعد ہم اس ایک پہلو پر بحث کریں گے کہ مارکس کے منفی جذبات پر مبنی اس مبہم فلسفے کو عملی دنیا میں نافذ کرنے کے لیے لینن نے کیا نظریہ انقلاب اور طریقِ انقلاب ایجاد کیا؟ اس نے اس نظریے اور طریقے کے تحت لائے ہوئے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کیے؟ اس نظریے اور طریقے سے مارکس ہی کی تعلیمات کی بنیاد پر جن لوگوں نے اختلاف کیا، ان کے ساتھ لینن نے کیا سلوک کیا اور مزدوروں کے نام پر اٹھائے ہوئے اس فلسفے اور ان کے نام پر برپا کیے ہوئے اس انقلاب کے کیا ثمرات انسانیت نے چکھے۔

ذرائع پیداوار کو قومیانے کے نظریہ کو اختیار کرنے کے بعد یہ نہایت اہم عملی سوال سامنے آتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے قوت کہاں سے اور کیسے حاصل کی جائے؟ نیز اس قوت کو قائم رکھنے اور استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہو؟

مارکس اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ قوت اقتدار کی سیاسی قوت ہو گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت مزدوروں کے قبضے میں آ جائے۔ مزدور حکومت پر قبضہ کیسے کریں گے؟ اس سلسلے میں مارکس کا خیال یہ ہے کہ بعض ممالک میں پُرامن جمہوری طریقے بھی اس غرض کے لیے مفید ہو سکتے ہیں اور بعض ملکوں میں دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ہیگ میں مزدوروں کی جو انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی اس کے

خاتمے پر مارکس نے اپنے اس خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"محنت کی تنظیم نو کے لیے ناگزیر ہے کہ مزدور سیاسی قوت پر قبضہ کرے۔ اگر عیسائیوں کی طرح وہ اس دنیا کی چیزوں سے نفرت نہیں کرتا اور وہ انہیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا تو اسے وہ پرانی پالیسی بدلنی ہوگی جسے پرانے ادارے چلا رہے ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر ہرگز زور نہیں دیتے کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ ہر جگہ ایک ہی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں مختلف ملکوں کے اداروں، طریقوں اور روایات کا لحاظ ضروری ہے۔ ہم اس بات سے قطعاً انکار نہیں کرتے کہ امریکہ، برطانیہ اور اگر میں غلط نہیں سمجھتا تو ہالینڈ کی طرح کے ایسے ممالک موجود ہیں جہاں مزدور پُرامن جمہوری طریقوں سے اپنا یہ مقصد حاصل کر سکتا ہے، لیکن تمام ملکوں میں ایسا ممکن نہیں[1]"

مزدور جب پُرامن جمہوری طریقوں یا دوسرے ذرائع سے سیاسی اقتدار پر قابض ہو جائیں تو اس سے اشتراکی مقاصد کے لیے کام لینے کی خاطر مارکس کے نزدیک "پرولتاری آمریت" قائم کی جائے گی، جس کی نوعیت ایک طرف تو یہ ہوگی کہ یہ اقلیت پر اکثریت کی آمریت ہوگی اور دوسری طرف اس کی حیثیت ایک عبوری حکومت کی ہوگی۔ کیونکہ مارکس کا خیال یہ تھا کہ ذرائع پیداوار جب قومی ملکیت میں آجائیں گے تو اس کے کچھ عرصہ بعد ریاست خود بخود تحلیل ہو کر ختم ہو جائے گی اور ایک ایسا جنت نظیر معاشرہ معرضِ وجود میں آجائے گا جس میں نہ تو کوئی استحصال کرنے والا (EXPLOITER) ہوگا اور نہ وہ جس کا استحصال (EXPLOITED) کیا جائے۔

یہ بات بڑی حد تک وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مارکس جیسے فلسفی کی پوری سیاسی تعلیمات کا یہ نچوڑ ہے جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے عرض کر چکے ہیں کہ مزدور کی خستہ حالت اور سرمایہ دارہ کے مظالم دیکھ کر مارکس کے اندر اتنا شدید ردعمل پیدا ہوا کہ اس کا ذہن بنیادی طور پر بس اسی ایک معاشی پہلو پر مرتکز ہو کر رہ گیا کہ ذرائع پیداوار کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں نہ رہنے دو اور زندگی کے دوسرے اہم ترین شعبے اس کی توجہ اپنی طرف اتنی نہ کھینچ سکے جتنا ان کا حق تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مارکس کی تعلیمات پر مشتمل دو اساسی کتابوں "سرمایہ" اور "اشتراکی منشور" میں سے

---

[1] KANTSKY : THE DICTATORSHIP OF THE PROLETARIAT P. 9, 10

کسی ایک میں بھی ان بنیادی سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا گیا جن کے بغیر مارکس کے معاشی تصورات کو بھی عملی شکل نہیں دی جا سکتی۔ مزید براں یہ کہ مارکس اور اینجلز میں سے کسی ایک نے بھی "پرولتاری انقلاب" یا "پرولتاری آمریت" پر کوئی کتاب ہی نہیں بلکہ کوئی ایک جامع مضمون بھی سپرد قلم نہیں کیا حالانکہ ماسکو میں سرکاری اہتمام میں چھپنے والی "سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مختصر تاریخ"[1] کے مصنفین کے نزدیک بھی "پرولتاری انقلاب" اور "پرولتاری آمریت" ہی مارکس کی اصل تعلیمات ہیں۔

اوپر ہم نے مارکس کے سیاسی نظریات کا جو خلاصہ پیش کیا ہے اس کے تین مآخذ ہیں۔ پہلا ماخذ ہیگ انٹرنیشنل میں اس کی تقریر، دوسرا ماخذ جرمن سوشلسٹ وائیڈمیر (WEIDEMYER) کے نام مارکس کا ایک ذاتی خط اور تیسرا ماخذ جرمن سوشلسٹوں کے نام گوتھا پروگرام کے متعلق اس کی ایک چٹھی

اس اختصار اور ابہام کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارکس کے ماننے والے بلکہ اس کی عقیدت و محبت اور احترام کے جذبات سے سرشار سوشلسٹوں میں "پرولتاری انقلاب" "پرولتاری انقلاب کے طریقوں" اور "پرولتاری آمریت" کے بارے میں شدید اختلافات رونما ہوئے۔ مارکس کے نظریات میں اسی ابہام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لینن نے نہایت خطرناک اور انسانیت کش ہتھکنڈوں کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو کر اپنے مخالفین کو وحشیانہ طریقے سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ آئندہ بحث میں ہم سوشلسٹوں کے انہی اختلافات اور لینن کے ہتھکنڈوں کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

بالشویک اور ان کے مخالفین اس سلسلے میں دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک بالشویک اور دوسرے کے لیے جامع نام غیر بالشویک ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں بالشویک، سوشل ڈیموکریٹس، کیڈٹ اور دوسرے کئی گروہ شامل ہیں، جن کے آپس میں بعض دیگر معاملات میں تو اختلافات ہیں لیکن مندرجہ بالا مسائل پر وہ بالشویک گروہ کے مقابلے میں تقریباً ایک سی رائے رکھتے ہیں۔

بالشویک گروہ کا رہنما لینن تھا جسے آج پوری اشتراکی دنیا میں مارکس اور اینجلز کے بعد سب سے اونچا مقام حاصل ہے اور جس طرح مارکسزم سے انحراف مذہب اشتراکیت سے "ارتداد" کے مترادف ہے اسی طرح لینن ازم سے اختلاف بھی "تجدد پرستی" اور "خارجیت" کا ہم معنی ہے۔ لینن کے بعد اس کے فلسفۂ انقلاب کو اس کے منطقی

[1] اے شارٹ کورس ان دی ہسٹری آف دی کمیونسٹ پارٹی آف دی سوویٹ یونین۔

نتائج تک پہنچانے والا شاہان ہے جو اپنے دورِ اقتدار میں تو عظیم باپ تھا لیکن مرنے کے بعد اس کے اپنے ہی ساتھیوں نے اسے سفاک اور ظالم کہا اور خود اس کی بیٹی نے پوری دنیا کے سامنے اس کے بہیمانہ مزاج اور کردار کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

دوسرے گروہ کے قائد کارل کاٹسکی (KARL KAUTSKY) مارٹوف (MARTOV) ہینڈرسن (HANDERSON) ایکسل راڈ (AXELROD) برن شٹین (BERNSTIEN) پلیخنوف (PLEKHANOV) میکڈونلڈ (MACDONALD) کیمی نیف (KAMENEV) سخانوف (SUKHANOV) پوٹریسوف (POTRESOV) کالوکولنگوف (KOLOKOLNEKOV) پٹرم سارکن (PITIRIM SOROKIN) اور بے شمار دوسرے لوگ ہیں۔ یہ تمام لوگ اشتراکی مکتبِ فکر کے نہایت بلند پایہ دانشور اور رہنما ہیں، ان میں سے پلیخوف لینن کا عظیم اُستاد ہے جسے خود لینن نے روسی مارکسیت کا باپ کہا تھا۔ کیمی نیف سوویٹ پارلیمنٹ کا پہلا چیئرمین تھا۔ کارل کاٹسکی ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۰ء تک مسلسل چھ سال انجلز کی براہِ راست نگرانی اور رہنمائی میں کام کرتا رہا اور مارکس کی شاگردی کا اعزاز بھی اسے حاصل ہوا۔ ان لوگوں نے مارکس کی اصطلاحات "پرولتاری انقلاب" اور "پرولتاری آمریت" کا مفہوم یہی سمجھا کہ یہ انقلاب پرولتاری طبقہ اپنی غیر معمولی اکثریت کے بل بوتے پر پُرامن طریقوں سے برپا کرے گا۔ ان کی رائے میں منظم مزدور انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹوں میں اکثریت حاصل کریں گے اور اس طرح وہ سیاسی طاقت کے مالک بن جائیں گے۔ اس طریقے سے حاصل کی ہوئی سیاسی طاقت کی مدد سے وہ اپنے اشتراکی نظریات کے مطابق پورا نظامِ زندگی بدل دیں گے۔ یہی اکثریت کی حکومت ان کے نزدیک "پرولتاری آمریت" ہے۔ ان کی رائے میں اگر "پرولتاری انقلاب" اور "پرولتاری آمریت" کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور لیا جائے، جیسا کہ لینن اور اس کے حواری لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ تباہی کی شکل میں نکلے گا۔

غیر بالشویک گروہ کے رہنما جمہوریت کے بغیر سوشلزم کو ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں اور اس معاملے میں انہوں نے لینن سے پوری طرح ٹکر لی۔

کاٹسکی کے نظریات کارل کاٹسکی اپنی فکری پختگی اور مارکس اور انجلز کی براہِ راست شاگردی کی وجہ سے غیر بالشویک

گروہ کی رائے نہایت نپے تُلے انداز میں پیش کرتا ہے۔ لینن اسے غیر بالشویک نقطۂ نظر پر نمایاں سند اور اس گروہ کا ترجمان تسلیم کرتا ہے۔ تاہم اس موضوع پر اس نے ڈیڑھ سو صفحات کی ایک کتاب "پرولتاری آمریت (ڈکٹیٹرشپ) آف دی پرولی تیریٹ" لکھی ہے جس کا اندازِ بیان سُلجھا ہُوا اور جس کی زبان استدلال کی زبان ہے اس لیے اس گروہ کا نقطۂ نظر ہم کاٹسکی کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی اسی کتاب کے صفحات ۶ و ۷ پر لکھتا ہے:

"ہمارے نزدیک سوشلزم جمہوریت کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ سوشلزم کو جمہوریت سے جُدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جمہوریت کے بغیر سوشلزم ممکن نہیں جبکہ جمہوریت سوشلزم کے بغیر ممکن ہے۔"

اس کے بعد کاٹسکی انقلابی طریقوں کے مسئلے پر بحث کرتا ہے۔ وہ اس نقطۂ نظر کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ زیرِ زمین خفیہ طریقوں پر تنظیم کر کے مسلح انقلاب برپا کیا جائے۔ اس کی بڑی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ اس طرز پر قائم ہونے والی تنظیموں اور برپا ہونے والے انقلابوں کا نتیجہ لامحالہ فردِ واحد کی آمریت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۱۹-۲۰ پر کاٹسکی لکھتا ہے:

"عوام کو خفیہ طریقوں سے منظم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خفیہ تنظیم کبھی جمہوری نہیں ہو سکتی۔ ایسی تنظیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ فردِ واحد یا چند نمایاں افراد کی آمریت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی تنظیم کے عام ارکان احکامِ بالا کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محض ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں جمہوریت نہ ہو وہاں ممکن ہے کہ کسی پسے ہوئے گروہ کے لیے اس طرز کی تنظیم ضروری محسوس ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایسی تنظیم عوام کی آزادی اور ان کی اپنی حکومت کے قیام کا ذریعہ بنے۔"

کاٹسکی کہتا ہے کہ نچلے طبقے کی ہمیشہ اکثریت ہوتی ہے اور استحصال کرنے والے ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اس لیے اگر صحیح قسم کے جمہوری طریقے اختیار کیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ نچلے طبقے برسرِ اقتدار نہ آجائیں اور اپنی اکثریت کی مرضی کے مطابق جمہوری طریقوں سے اپنے مفادات کے لیے کام نہ کر سکیں۔ یہی سبب ہے کہ یہ

طبقے بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات کا مطالبہ کرتے ہیں کاٹسکی اپنی کتاب کے صفحات ۲۷، ۲۸ پر رقمطراز ہے:

"نچلے طبقوں اور عوام کا اصولی مطالبہ حق بالغ رائے دہی کا ہے۔ صرف اُجرت حاصل کرنے والے مزدور ہی نہیں بلکہ چھوٹے کسان اور نچلے درمیانی طبقے کے لوگ بھی حق بالغ رائے دہی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں یہ طبقات آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں پرولتاری اکثریت میں ہیں یا نہیں اس کا انحصار معاشی ترقی پر ہے۔ استحصال کرنے والے ہمیشہ آبادی کی ایک چھوٹی سی اقلیت ہوتے ہیں۔"

اپنی اس بات کی حمایت میں وہ "اشتراکی منشور" سے مارکس اور اینجلز کا حوالہ ان الفاظ میں دیتا ہے:

"اس سے پہلے کی تمام تحریکیں اقلیتوں کی تحریکیں تھیں اور انہوں نے اقلیتوں ہی کے مفاد کے لیے کام کیا۔ پرولتاری تحریک بہت بھاری اکثریت کی آزاد تحریک ہے جس کے پیش نظر اکثریت کا مفاد ہے۔"

اسی سے کاٹسکی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مارکس کے نزدیک "پرولتاری آمریت" کسی طرز حکومت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک اجتماعی ماحول ہے جو صحیح جمہوریت میں پرولتاریوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کاٹسکی کہتا ہے کہ آمریت کو طرز حکومت کی حیثیت سے اپنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حزب اختلاف کو ووٹ، پریس اور اجتماع کی آزادی سے محروم کر کے بے دست و پا کر دیا جائے۔ جبکہ فتح یاب پرولتاریوں کو ایسے ذرائع اختیار کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ایک ایسی حکومت جسے یہ معلوم ہو کہ عوام اس کی پشت پر ہیں، وہ طاقت کو جمہوریت ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ جمہوریت کی حفاظت کے لیے استعمال کرے گی۔ اس حکومت کے لیے جمہوریت کو ختم کرنا تو خودکشی کے مترادف ہے کیونکہ ایسے اقدامات سے وہ اپنے اقتدار کی اخلاقی بنیادوں کو مسمار کرتی ہے۔

اس اصولی استدلال کے بعد کارل مارکس اور اینجلز کا شاگرد خاص کارل کاٹسکی بجا طور پر یہ کہتا ہے کہ آمرانہ طرز حکومت اختیار کرنے کی ضرورت اکثریت کو نہیں اقلیت کو پیش آتی ہے اور وہ اقلیت اگر تشدد کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو جائے اور فوجی قوت کے ذریعے وہ، ———

اس تسلط کو قائم رکھنا چاہے تو وہ اپنے مخالفین کو ختم کرنے کے لیے انتہائی سفاکانہ طریقے استعمال کرتی اور خون کی ندیاں بہا دیتی ہے۔ ایسی حکومت کو جب کسی بغاوت کا خطرہ ہو تو اسے دبانے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر سکتی ہے۔

بالشویکوں کی غلط اندیشیاں اور غلط کاریاں | یہ کلیہ دوسری کسی بھی اقلیت کی طرح روسی بالشویکوں پر بھی صادق آتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جب بالشویکوں نے روس میں خونی انقلاب برپا کیا تو وہ ایک حقیر سی اقلیت تھے۔ اس بات پر قارئین کو تعجب ہوگا کہ ماسکو میں ۱۹۵۸ء میں چھپی ہوئی کتاب "سوویٹ روس میں محنت کے سوالات (QUESTIONS OF LABOUR IN THE U.S.S.R.) کے صفحہ ۹ پر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ بالشویک انقلاب کے وقت صنعتی مزدور (پرولتاری) کل آبادی کا صرف ۲،۵ فیصد تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس معمولی پرولتاری اقلیت کی سوویٹس کی پہلی کانگریس کا جو اجلاس جون ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوا اس میں بالشویک صرف دس فیصد تھے۔ ان حالات میں بالشویک گروہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے آمرانہ اور تشددانہ اقدامات پر مجبور ہو گیا۔ اس کی وضاحت کاٹسکی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہمارے بالشویک ساتھیوں نے یورپ بھر میں ہمہ گیر انقلاب کی توقع پر اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔ جب یہ امید بر نہ آئی تو وہ لاینحل مسائل میں اُلجھ گئے۔ انہیں کسی فوج کے بغیر نہایت مضبوط دشمن کے مقابلے میں اپنے ملک کی حفاظت کرنا تھی۔ انہیں اکھاڑ پچھاڑ اور غربت و افلاس کے ماحول میں سب لوگوں کی بہبود کا نظام قائم کرنا تھا۔ جو آرزوئیں انہوں نے سینوں میں پالی تھیں، ان کے لیے مادی اور ذہنی فضا سازگار نہ تھی اس لیے بالشویکوں نے اس کمی کو عُریاں قوت یعنی آمریت کے ذریعے پُورا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ ہتھیار جتنا زیادہ استعمال کیا، عوام میں ان کی مخالفت اتنی ہی بڑھتی گئی۔ اس بنا پر وہ مجبور ہو گئے کہ جمہوریت کی جگہ آمریت کو اپنائیں[1]"

اگر بالشویک اپنی ان توقعات میں غلط ثابت ہوئے کہ حکومت پر ان کے قابض ہوتے ہی پورے یورپ میں انقلاب کی راہیں کھل جائیں گی تو اس سے کچھ زیادہ ہی فریب انہوں نے اس بارے میں کھایا کہ جونہی

[1] کاٹسکی، پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ۔

انہیں اقتدار حاصل ہو جائے گا عوام کی اکثریت خوشیوں کے ترانے گاتی ہوئی انہیں خوش آمدید کہے گی اور نہایت شوق سے ان کی پیروی کرے گی۔ اس کے برعکس ہوا یوں کہ روس کے خاص حالات میں بالشویک اپنے مضبوط پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے زار حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا کر کے اس پوزیشن میں ہو گئے کہ ریاست کے اقتدار پر چھا جائیں لیکن کیا واقعی عوام ان کی پشت پر تھے؟ اس کا پتہ دستور ساز اسمبلی سے چلنا چاہیے تھا جس کا مطالبہ دوسرے انقلابیوں کی طرح بالشویکوں نے بھی کیا۔ اور بڑی شدت کے ساتھ کیا . . . . . کچھ مدت بعد اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ اس میں برسر اقتدار بالشویک اقلیت میں رہے تو لینن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جو اسمبلی منتخب ہوئی ہے وہ مناسب نہیں کیونکہ وہ عوام کی صحیح آواز کی نمائندگی نہیں کرتی۔ لینن نے یہ اعلان کیا کہ براہِ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کی منتخب کردہ پارلیمنٹ موزوں نہیں ہو سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ لینن کو اس بات کا علم اس وقت ہوا جب بالشویک دستور ساز اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکے۔

(باقی)

مریم جمیلہ کی انگریزی تصانیف

"ISLAM INTHEORY AND PRACTICE"

اِسلام اِن تھیوری اینڈ پریکٹس قیمت : دس روپے

"ISLAM AND MODERNISM"

اسلام اینڈ ماڈرن ازم قیمت : ۹ روپے

"ISLAM VERSUS THE WEST"

اسلام ورسز دی ویسٹ قیمت : ۴ روپے

"AHMAD KHALIL" احمد خلیل (ناول) ایک فلسطینی مہاجر کی کہانی۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

محمد یوسف خاں سنت نگر۔ لاہور